اسلام میں خواتین کے حقوق

مساوات یکسانیت نہیں

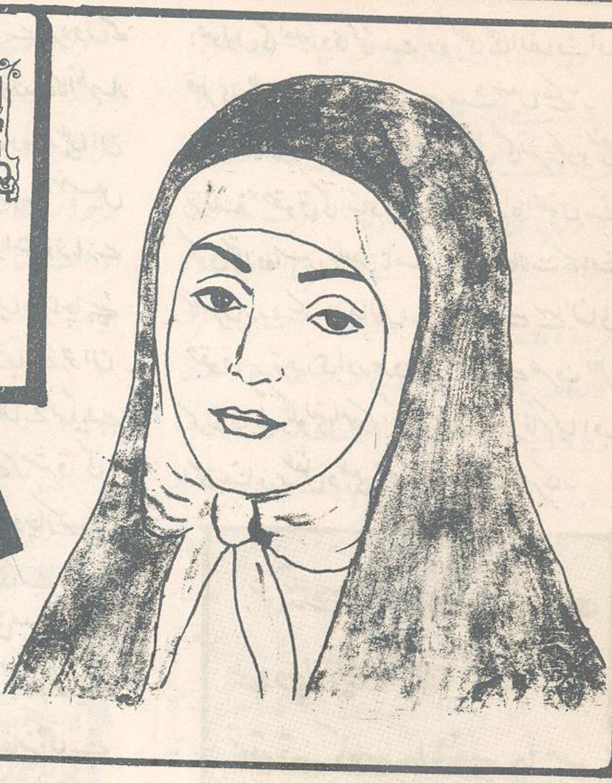

جیسا کہ ہم نے کہا ہے اسلام مرد وزن کے عائلی حقوق اور روابط کے سلسلے میں ایک ایسے مخصوص فلسفہ کا حامل ہے جو نہ صرف گذشتہ چودہ سو سال کے تمام نظریات سے متغائر ہے بلکہ عصر حاضر کے مروجہ تصورات سے بھی مطابقت نہیں رکھتا۔

ہم پہلے ہی واضح کر چکے ہیں کہ اسلام کے نقطۂ نظر سے یہ مسئلہ ہرگز بحث طلب نہیں کہ مرد و عورت بحیثیت انسان مساوی ہیں یا نہیں نیز یہ کہ ان کے عائلی حقوق وقعت و اہمیت کے لحاظ سے مساوی ہونے چاہئیں یا نہیں۔ اسلامی نقطۂ نظر سے عورت اور مرد دونوں انسان ہیں اور انسانی حقوق سے بہرہ اندوز ہونے میں برابر کے حقدار ہیں۔

اسلامی نقطۂ نظر سے جو چیز بالکل صاف اور واضح ہے وہ یہ ہے کہ عورت اور مرد اپنی اپنی جگہ مکمل انسان ہونے کے باوجود بیشتر چیزوں میں ایک دوسرے کے ساتھ کامل مشابہت و مماثلت نہیں رکھتے۔ ان دونوں کے لیے دنیا بالکل ایک جیسی نہیں ہے اور خلقی و طبعی اعتبار سے بھی دونوں یکساں نہیں ہیں۔ اسی عدم یکسانیت کے باعث ان کے حقوق و فرائض اور سزا و جزا کے پیمانے بھی مختلف ہونے چاہئیں۔ آج مغرب میں عورتوں اور مردوں سے متعلق احکام و قوانین اور حقوق و فرائض میں یکنوعی اور یکسانیت پیدا کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے اور ان کے جبلّی و طبعی فرق کو نظر انداز کیا جا رہا ہے۔ اسلام اور مغربی طرز فکر میں بنیادی اختلاف یہی ہے۔ ہمارے ملک میں اسلام پسندوں اور مغرب گزیدوں میں وجہ اختلاف مرد وزن کے حقوق میں وحدت و یکسانیت ہے نہ کہ برابری و مساوات۔ حقیقت یہ ہے کہ مغرب کے مقلّد "مساواتِ حقوق" کے خوشنما الفاظ ایک پُرفریب لیبل کے طور پر استعمال کر رہے ہیں۔

راقم الحروف نے اپنی تحریروں، کانفرنسوں اور خطبوں میں اس پُرفریب لیبل کو استعمال کرنے اور اس مفروضہ کو جو عورتوں اور مردوں کے حقوق میں یکسانیت و مماثلت کے ادعا کے علاوہ اور کچھ نہیں مساواتِ حقوق کے نام سے یاد کرنے سے اجتناب کیا ہے۔

میرے کہنے کا مقصد یہ ہرگز نہیں کہ دنیا میں کسی بھی جگہ حقوق میں مساوات کا دعویٰ معنویت نہیں رکھتا تھا یا آج بھی نہیں رکھتا ہے اور یہ کہ ماضی و حال کے تمام قوانین مرد وزن کے حقوق میں مساوی وقعت و اہمیت کی بنیاد پر وضع کئے گئے ہیں اور ان میں صرف یکسانیت کا فقدان ہے۔ نہیں میں ایسا کوئی دعویٰ نہیں کرتا۔ بیسویں صدی سے قبل کے یورپ میں عورت قانوناً اور عملاً انسانی حقوق سے محروم تھی۔ اس کے اور مردوں کے حقوق میں نہ تو مساوات تھی اور نہ یکسانیت۔ گذشتہ ایک صدی سے بھی کم کے عرصہ میں عورت کے نام سے اور عورت کے لیے جو عاجلانہ تحریک وجود میں آئی اس کے زیر اثر مرد وزن کے حقوق میں کم و بیش یکسانیت پیدا ہوگئی۔ لیکن عورت اپنی طبعی

وضع قطع اور روحانی وجسمانی احتیاجات کے باعث مرد کے مساوی حقوق حاصل کرنے میں ناکام رہی ہے لہٰذا اگر عورت یہ چاہتی ہے کہ اس کے حقوق مرد کے حقوق کے مساوی ہوں اور وہ بھی اسی سعادت و مسرت سے ہمکنار ہو سکے جو مرد کو حاصل ہے تو اس کا واحد طریقہ یہ ہے کہ مردوں کے ساتھ اپنے حقوق میں یکسانیت کے دعوے سے دستبردار ہو جائے اور اس امر کی قائل ہو جائے کہ مردوں کے لیے موزوں حقوق مردوں کو اور عورتوں کے لیے موزوں حقوق عورتوں

> یہ بات پیش نظر رہنی چاہیئے کہ ہمارا دعویٰ یہ ہے اور یہی شرط انصاف بھی ہے کہ مردوزن کے فطری وانسانی حقوق میں سے صرف کچھ حقوق میں عدم یکسانیت ہونی چاہیئے۔ لہٰذا ہماری بحث صدفی صد فلسفیانہ ہے اس کا تعلق فلسفہ حقوق میں سے ہے۔

کو ملنے چاہییں۔ صرف اسی صورت میں عورتوں اور مردوں کے درمیان حقیقی اخلاص و اتحاد قائم ہو سکتا ہے نیز عورت مرد کے برابر ہی نہیں بلکہ اس سے بھی زیادہ فلاح وسعادت سے بہرہ مند ہو سکتی ہے۔ بایں صورت مرد بغیر کسی مکر وفریب کے ازراہ اخلاص ومروّت عورتوں کو نہ صرف مساوی بلکہ اپنے سے بھی زیادہ حقوق دینے پر آمادہ ہو جائیں گے۔

اسی طرح میرا یہ دعویٰ بھی نہیں ہے کہ اسلامی معاشروں میں بظاہر جو حقوق عملاً عورتوں کو دیئے گئے ہیں وہ وقعت واہمیت کے لحاظ سے مردوں کے برابر ہیں۔ میں نے بارہا اس امر کی ضرورت کا اظہار کیا ہے کہ عورتیں جس صورت حال سے دوچار ہیں ان کی مکمل تحقیق کی جانی چاہیئے اور اسلام نے انہیں جو فراخدلانہ حقوق عطا کیے ہیں اور جو امتداد زمانہ سے عملاً متروک ہو گئے ہیں انہیں بحال کیا جانا چاہیئے نہ یہ کہ مغربی طرز زندگی کی اندھی تقلید کیجائے جو ان کے لیے بے شمار مصائب اور پریشانیاں لے کر آیا ہے اور نہ یہ کہ ایک غلط مفروضہ کو خوشنما نام دے کر مشرق کی عورت کو ان مصائب ومشکلات سے دوچار کر دیا جائے جو مغرب کی عورت کا مقدر بن چکی ہے۔ ہمارا مدعا یہ ہے کہ مردوں اور عورتوں کے حقوق میں اسی حد تک عدم یکسانیت ہونی چاہیئے جس حد تک وہ طبعاً ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ یہی انصاف کا تقاضا بھی ہے اور یہی چیز ان کے فطری حقوق سے مطابقت بھی رکھتی ہے۔ اس میں خانگی زندگی کی مسرت وخوشحالی اور معاشرہ کی بہتری وترقی مضمر ہے۔

یہ بات پیش نظر رہنی چاہیئے کہ ہمارا دعویٰ یہ ہے اور یہی شرط انصاف بھی ہے کہ مردوزن کے فطری و انسانی حقوق میں سے صرف کچھ حقوق میں عدم یکسانیت ہونی چاہیئے۔ لہٰذا ہماری بحث صدفی صد فلسفیانہ ہے، اس کا تعلق فلسفہ حقوق میں سے ہے اور "اصول عدل" سے مربوط ہے جو اسلامی فقہ وکلام کے ارکان میں سے ایک ہے۔ "اصول عدل" وہی ہے جس کی بنیاد پر اسلام میں عقلیت اور شریعت میں مطابقت کا قانون وجود میں آتا ہے۔ یعنی اگر فقہ اسلامی کم از کم فقہ شیعہ کی رو سے یہ ثابت ہو جائے کہ بربنائے انصاف فلاں قانون ایسا نہیں ویسا ہونا چاہیئے اور بصورت موجودہ وہ ظالمانہ اور خلاف انصاف ہے تو ہمیں تسلیم کرنا پڑے گا کہ حکم شریعت بھی یہی ہے۔ کیونکہ شریعت اسلامی میں جن اساسی اصولوں کی تعلیم دی گئی ہے وہ کبھی بھی انصاف اور فطری وطبعی حقوق کے محور سے ہٹ نہیں سکتے۔

علمائے اسلام نے "اصول عدل" کی تشریح وتوضیح پر فلسفہ حقوق کی بنیاد رکھی۔ حالانکہ جو راہ انھوں نے کھولی تھی وہ اس پر بعض نامساعد تاریخی حالات کے باعث گامزن نہ رہ سکے۔ مسلمانوں نے سب سے پہلے انسانی حقوق پر توجہ دی اور مروجہ قوانین سے صرف نظر کر کے جبلّی وتکوینی امور کو "اصول عدل" پر قائم کیا اور اسی بنیاد پر عقلی وطبعی حقوق کی عمارت تعمیر کی۔

> عورتیں جس صورت حال سے دوچار ہیں ان کی مکمل تحقیق کی جانی چاہیئے اور اسلام نے انہیں جو فراخدلانہ حقوق عطا کیے ہیں اور جو امتداد زمانہ سے عملاً متروک ہو گئے ہیں انہیں بحال کیا جانا چاہیئے

لیکن تقدیر کی ستم ظریفی سے وہ اپنا کام جاری نہیں رکھ سکے اور تقریباً بیس صدی کے بعد یورپ کے دانشوروں اور مفکروں نے ان نظریات کی پیروی کی اور کامیابی کا سہرا اپنے سر باندھ لیا۔ ایک طرف تو انھوں نے سماجی، سیاسی اور اقتصادی فلسفوں کو جنم دیا اور دوسری طرف عوام، معاشروں اور قوموں کو زندگی کی قدر وقیمت اور انسانی حقوق سے آشنا کیا اور مختلف تحریکات اور انقلابات کے ذریعہ دنیا کا نقشہ ہی بدل ڈالا۔

میرے نقطۂ نظر سے تاریخی اسباب وعلل کے

علاوہ کچھ نفسیاتی اور علاقائی عوامل بھی اس مسئلہ میں کارفرما رہے ہیں۔ مشرق اسلامی جس نے حقوق کی بنیاد عقلیت پر رکھی تھی اُن کی ترویج و اشاعت میں معروفِ عمل نہ رہ سکا۔ مشرق اور مغرب کے مزاج میں ایک بنیادی فرق یہ ہے کہ مشرق اخلاقیات کا دلدادہ ہے اور مغرب حقوق کا۔ اہلِ مشرق کی فطرت کا تقاضہ یہ ہے کہ وہ بنی نوع انسان کے ساتھ محبت رواداری اور فراخدلی کا سلوک کریں البتہ اہل مغرب کے نزدیک انسانیت کا مفہوم یہ ہے کہ وہ اپنے حقوق سے بخوبی آگاہ ہوں، ان کا تحفظ کریں اور کسی دوسرے شخص کو اپنے دائرہ حقوق میں قدم نہ رکھنے دیں۔

بشریت کا تعلق اخلاقیات سے بھی ہے اور حقوق سے بھی۔ انسانیت اخلاقیات سے بھی وابستہ ہے اور حقوق سے بھی۔ حقوق اور اخلاقیات میں سے کوئی ایک چیز تنہا معیارِ انسانیت نہیں ہے۔

دینِ مقدس اسلام کا طرۂ امتیاز یہ ہے کہ اس نے حقوق اور اخلاقیات کو باہم کر موردِ توجہ قرار دیا ہے۔ اسلام میں جہاں رواداری، اخلاص اور نیکوکاری بحیثیت اخلاقی امور مقدس شمار کئے جاتے ہیں وہاں اپنے حقوق سے آگاہی اور انکا دفاع بھی مقدس اور انسانی فطرت کے عین مطابق سمجھا جاتا ہے۔ یہ موضوع تفصیل طلب ہے اور اس کی وضاحت کا یہاں موقع نہیں ہے۔

لیکن اس سلسلے میں مشرقی مزاج بروئے کار آیا۔ ابتدا میں اس نے اسلام سے حقوق اور اخلاقیات دونوں میں کسب فیض کیا لیکن رفتہ رفتہ حقوق سے دست کش ہوگیا اور اس کی تمام تر توجہ اخلاقیات تک محدود ہو کر رہ گئی۔

غرض یہ کہ آج ہم جس مسئلہ سے دوچار ہیں وہ حقوق کا مسئلہ بھی ہے، اس کا تعلق فلسفہ و تعقل سے بھی ہے اور اس کی نوعیت استدلالی و منطقی بھی ہے۔ مزید برآں یہ مسئلہ حقیقت عدل اور ماہیت حقوق سے بھی مربوط ہے۔ دنیا کے کسی بھی قانون کے وضع ہونے سے قبل انصاف اور حقوق وجود رکھتے تھے۔ قانون سازی کے ذریعے انصاف اور انسانی حقوق کی ماہیت کو تبدیل نہیں کیا جاسکتا۔

مونتسکیو اس امکان کی نشاندہی کرتا ہے کہ انسان کے قوانین وضع کرنے سے قبل موجودات کے درمیان قوانین پر مبنی عادلانہ روابط پائے جاتے تھے اور انہی روابط کی موجودگی قانون سازی کا موجب

دینِ مقدس اسلام کا طرۂ امتیاز یہ ہے کہ اس نے حقوق اور اخلاقیات کو باہم کر موردِ توجہ قرار دیا ہے اسلام میں جہاں رواداری، اخلاص اور نیکوکاری بحیثیت اخلاقی امور مقدس شمار کئے جاتے ہیں وہاں اپنے حقوق سے آگاہی اور ان کا دفاع بھی مقدس اور انسانی فطرت کے عین مطابق سمجھا جاتا ہے

ہوئی۔ اب اگر ہم یہ کہیں کہ ان اوّلین اساسی قوانین کے علاوہ جنکی اکثریت اور امر و نواہی پر مشتمل تھی کسی دوسرے قسم کے عادلانہ یا ظالمانہ قوانین وجود نہیں رکھتے تھے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہم دائرہ کھینچنے سے قبل اس کے نصف قطر کو غیر مساوی قرار دے رہے ہیں۔"

ہربرٹ اسپنسر کہتا ہے "انصاف کا تعلق جذبات سے جداگانہ کسی چیز سے ہے اور وہ چیز انسان کے طبعی حقوق سے عبارت ہے چونکہ انصاف ایک خارجی وجود کا حامل ہے لہٰذا ضروری ہے کہ حقوق اور طبعی اختلافات کا لحاظ اور احترام کیا جائے۔"

اس عقیدہ کے حامل حکمائے یورپ ماضی میں بھی بکثرت پائے جاتے تھے اور آج بھی موجود ہیں انسانی حقوق سے متعلق جو منشور اور اعلامیے تیار کئے گئے اور انسانی حقوق کے اعتبار سے جو متن ترتیب دیا گیا اس کا سرچشمہ طبعی حقوق یہی نظریہ ہے۔ یعنی طبعی و فطری حقوق کے نظریہ کو ہی انسانی حقوق کے منشور کی شکل دی گئی۔

ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ منتسکیو اور اسپنسر وغیرہ نے انصاف کے بارے میں جو کچھ کہا ہے وہ من و عن وہی ہے جو متکلمین اسلام عقلیت کے حسن و قبیح اور اصول عدل کے متعلق کہہ چکے ہیں۔ علمائے اسلام میں ایسے افراد موجود تھے جو حقوق کی جبلی نوعیت کے منکر تھے اور انصاف کو رواجی حیثیت دیتے تھے۔

اہل یورپ کا بھی یہی عقیدہ رہا ہے انگریز مفکر ہوبس انصاف کو امر واقعی نہیں سمجھتا۔